اسلام ایک عظیم جدوجہد

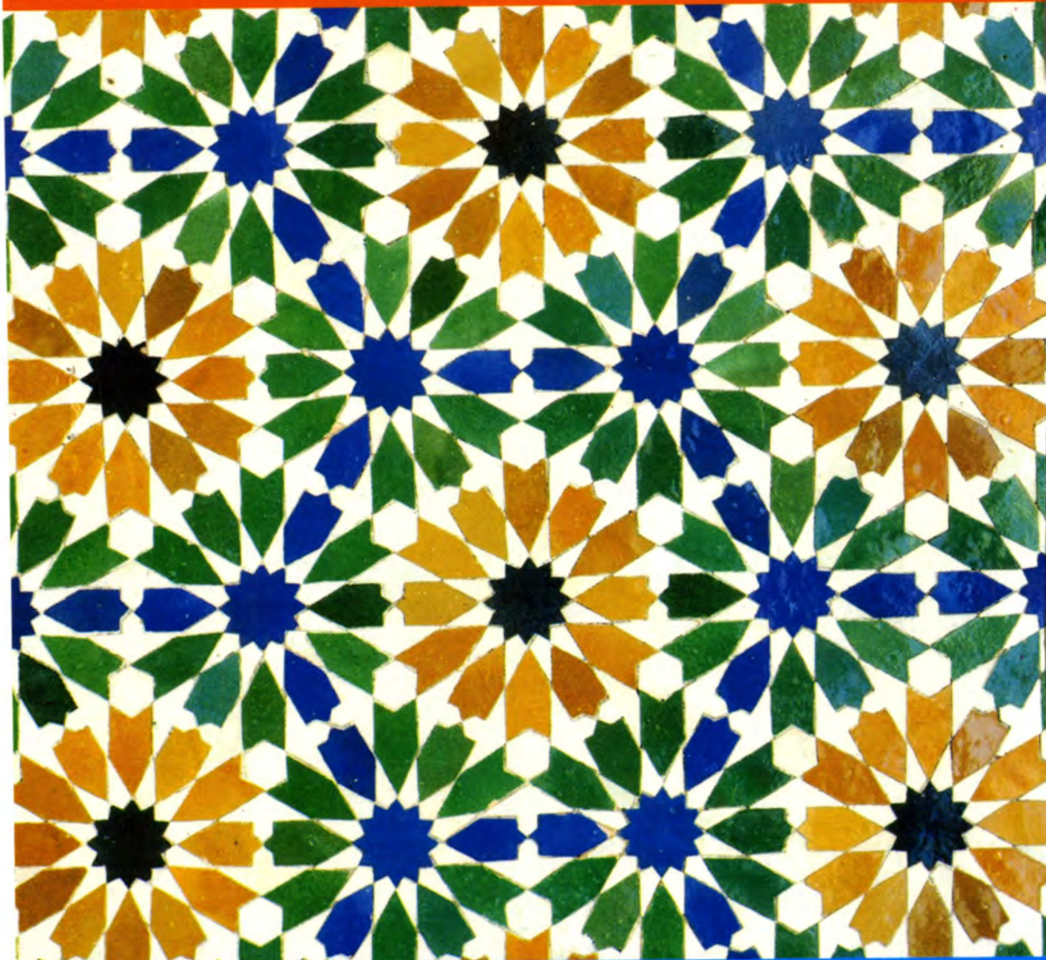

مولانا وحید الدّین خاں

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

مولانا وحید الدین خاں

Islam Ek Azeem Jad-o-Jahad
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1980
Reprinted 2017
This book is copyright free

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, India
Tel. +9111-46010170, +9111-45651770, +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Goodword Books, Chennai
Mob. +91-9790853944, 9600105558

Printed in India

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام

ایک عظیم جدوجہد

قرآن مالک کائنات کا فرمان ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لئے ہے اور ذلت کس کے لیے؟ کامیاب کون ہے اور نامراد کون؟ دنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دئے گئے ہیں ان کو استعمال کر کے اونچے درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر، اونچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں، اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے جو صفات مقرر کی گئی ہیں، اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں، وہ شخص ان کو عبور کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجہ میں اس نے اس بلند مقام کو پالیا ہے جو قانونِ وقت کے تحت اس کے لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنیٰ الہ دین کا چراغ پالینے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی صرف اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالآخر اپنی کوششوں کے نتیجہ میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی چلنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی بات کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

''لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، جھوٹ ہے''

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے۔ جہاں تمام اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے

ہوگی جو خدا کی رضا کو پالیں اور ذلّت اور نامرادی ان لوگوں کے لئے ہوگی جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقامِ بلند کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے لیے ایک لمبے عمل کے بعد آدمی اس کے اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انعام کسی پڑی ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ دنیوی کامیابی کی طرح وہ بھی ایک زبردست جدو جہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار اتر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں، جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے، بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے، بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہِ حق سے پھیر دینے میں لگی ہوئی ہیں، ان طاقتوں سے لڑ کر انھیں زیر کرنا ہے۔ غرض دشواریوں سے بھرا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کر کے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وحجلت النار بالشهوات وحجلت الجنة بالمكاره (متفق علیہ)	جہنم لذتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جنت تکلیفوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر کسی ایک لفظ سے تعبیر کرنا ہو تو اس کے لیے قربانی سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدو جہد ہے۔ وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور قلبی رجحانات کو خیرباد کہہ کر دینِ حق کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دُنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان

طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پار کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اثاثے بھی چھوڑ دینے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلۂ امتحان کی تکمیل ہے اور عہد بندگی کو آخری طور پر ثابت کر دکھانا ہے جو ایمان لا کر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔

یہ تین دور جن سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا مستحق بنتا ہے۔ ان کو قرآن میں ـــــ ایمان، ہجرت اور جہاد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

الذین آمنوا و هاجروا و جاهدوا فی سبیل الله باموالهم وانفسهم اعظم درجة عند الله و اولئك هم الفائزون۔ (التوبہ ۲۰)	جو لوگ ایمان لائے جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ دراصل کامیاب ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں تلقین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا اور جہاد سے مراد اس بات کی جدوجہد ہے کہ جس عقیدہ نے آدمی کے دل کے اندر جگہ بنائی ہے وہی زمین پر بھی عملاً موجود و مشہور ہو جائے۔ اس طرح یہ ـــــ ایمان، ہجرت اور جہاد ـــــ ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلۂ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو ممیّز کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ آج کی صحبت میں میں اختصار کے ساتھ ان تینوں کی تشریح کروں گا۔

ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لیجئے۔ یہ اس عظیم امتحانی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتداء زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہ کر آدمی اپنی جان دے دے۔ یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا مشاہدہ کر لیتا ہے، جب وہ خدا کے رسول کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ تخلیق کا یہ عظیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور مستقبل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے گا، تو اسی کیفیت کے مجموعہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازم معنیٰ یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈرا جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے، اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ ـــــ یقین، اعتماد اور خوف ـــــ کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے...... خدا اور رسول پر اس کلی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پولیس اور فوج کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یقین : جو ایمان کا پہلا جزء ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر غور کرتا ہے، رسول کی تعلیمات کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ تینوں چیزیں بالکل

ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا رسول جس حقیقت کی خبر دیتا ہے کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز ہمہ تن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی میں جو کچھ پڑھتا ہے، زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح قبول کر لیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی سائز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ مگر یقین کی یہ کیفیت اس کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی، جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت رو بہ کار ہوتی ہے جب اس کو نشو ونما دے کر ابھارا جائے۔ کائنات کا ہر راز اسی وقت ایمان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو گم کر چکا ہو اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو اخذ کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی واضح ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جدوجہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جزء **''اعتماد''** ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کارساز ہے جو اس کارخانہ کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دو اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرورت مند ہے۔ مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمولی بگاڑ بھی آ جائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنے کو ایک ایسی عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بے بس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ

جس کی اسے ضرورت تھی اس کے لئے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جسم دیا گیا ہے جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے۔ پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے۔ اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلند تر قوت ہو جو اس کی دستگیری کرے اور دوسرا احساس اس کی طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر خلاء کا احساس دلاتا ہے یہی مطالعہ ایک وقت اس خلاء کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جزء **''خــوف''** ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دو اجزاء یقین اور اعتماد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے، دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ کبھی بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی، اچھے بھی ہیں اور برے بھی تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے، جہاں سچوں کو ان کی سچائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا

ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی بھی امید رکھتا ہے، یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارے میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر اس کے اصولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے، وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے۔

ہجرت

اب ہجرت[1] کو لیجئے ــــ ہجرت کے معنٰی ہیں چھوڑنا، ترکِ تعلق کرنا، عام طور پر ہجرت کو ترکِ وطن کے ہم معنٰی سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لئے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے۔ مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترکِ وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترکِ علائق تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک شخص پر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس

---

[1] امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''المفہمات فی عریت القرآن'' میں اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہجر اور ہجران کا مطلب انسان کی دوسروں سے جدائی ہے خواہ وہ جسم سے ہو یا زبان سے ہو یا دل سے ہو۔ اللہ کا ارشاد ہے: واھجروھن فی المضاجع (اپنی عورتوں کو خوابگاہوں میں جدا چھوڑ دو) یہاں جسمانی علیٰحدگی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً (میری قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا) بقیہ صفحہ ۱۰ پر……

نے ماحول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لئے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہجرت کا آغاز ہے جب آدمی ناجائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلسل جدوجہد شروع ہو جاتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے، کتنے ہی اپنے لوگوں سے کٹنا اور کتنے ہی غیروں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوشگوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت سے ایک نیا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ لوگ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں وہ بالکل دو مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے چمٹا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا گروہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔

یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے رویہ کو غلط قرار دیتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک عملی کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے مطابق، زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کئے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ

صفحہ ۹ کا بقیہ: یہاں قلب کی علیٰحدگی یا قلب اور زبان دونوں کی علیٰحدگی مراد ہے اور واھجرھم ھجراً جمیلا (اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جا) میں تینوں قسم کی علیٰحدگی مراد ہو سکتی ہے۔ اور مہاجرت دراصل دوسروں کو چھوڑنا اور ان سے ترک تعلق کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: والذین ھاجروا و جاھدوا، یا للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم و اموالھم یا ومن یخرج من بیتہ مھاجراً الی اللہ، یا فلا تتخذوا منھم اولیاء حتٰی یھاجروا فی سبیل اللہ۔ ان آیات میں ظاہر ہے کہ دار الکفر سے نکل کر دار الاسلام میں جانا مراد ہے جیسا کہ لوگوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور علماء نے بھی کہا ہے کہ ہجرت کا مطلب شہواتِ نفس کو چھوڑنا اور برے اخلاق اور غلط کاریوں سے بچنا ہے۔''

سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو حاکم نہ بنادے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کرسکتا ہے، نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید وفروخت کرسکتا ہے، نہ عدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کرسکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھالے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے نہ دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد حلقوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہو جاتا ہے جو دن بدن نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے، قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے۔ جس میں برسر اقتدار طبقہ اہل حق کو ستانے اور ان کو ذرائع حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف مظالم کی شدت دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ سہیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ یہ کش مکش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ اس وقت اہلِ حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس بستی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائداد، اپنے عزیزوں، غرض ساری متاع حیات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا، بلکہ یہ ناحق کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان وطاغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں مومنین کی ہجرت کو ''ہجرت الی اللہ'' کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی طرف

ہجرت۔ ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا یہ عمل خدا پرستی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے، جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا۔ یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے۔ جب تک آدمی اس ہجرت کے لئے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو۔ جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے افکار اور رجحانات پرورش پا رہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انھیں کھرچ کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے یا کسی کا تعلق دین کی طرف کھل کر آنے میں روک بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیر باد کہہ دے۔ کسی معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے معیارِ زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں معاشی خوشحالی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمتِ دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو ان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلا رہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا ـــــ اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہٖ قابلِ اجتناب نہیں ہیں۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ مومن کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور قابل ترک قرار دیا ہے۔ ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور چال چلن کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ افکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام

گوشوں پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ جس طرح زمین کے گولے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہر پیدا ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشو ونما ہوتی ہے، ماحول کے افکار اور روایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ جب آدمی پر حق کا انکشاف ہوتا ہے تو سب سے پہلے ''دینِ آباء'' کو چھوڑنے کا مرحلہ اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرچ کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس صرف لذّتوں کو ڈھونڈتا ہے، اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعہ سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی دلچسپیوں اور مشغولیتوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگر چہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انھیں ترک کر دیتا ہے جو اگر چہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں شکست و ریخت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی چیزیں جو اس کو پچھلی زندگی میں نہایت عزیز تھیں، انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی، جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل مہم شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک پیہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے۔ یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات واطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورہ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانہ کی سورہ ہے۔ فرمایا:

والرجز فاهجر ؕ (مدثر ۵) گندگی سے ہجرت کر (یعنی خیال اور عمل کی تمام برائیوں کو چھوڑ دے)

یہی بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔ المهاجر من هجر ما نهى الله عنه۔ مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر ہمہ تن اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں، یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کر لے۔ بلکہ عین اسی کے ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دہرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگر چہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود مختار ہو کر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنا لینا ہے اور موت کی آخری گھڑی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا ہے، یعنی دوسرے بندگانِ خدا تک خدا کے پیغام کو پہنچانا اور اس کے دین کو عملاً زمین کے اوپر قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ یہ اتنا گراں بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جاں گسل کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ دعوت حق اور اقامت دین کے علاوہ کسی کام میں وہ جتنا وقت اور

قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسی کے بقدر وہ اصل فریضہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کرے۔ دنیا کے اندر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے اور اپنی ذات کے لیے کم سے کم مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضروریات کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادتِ دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا ہو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص ''دیندار'' بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کی مہم شروع کیجئے تو آپ کو بہت سی حلال چیزوں سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتداء بھی نہیں کی جاسکتی اور اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیتی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برسرحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے برسرحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تا کہ آپ اس کے پر جوش مبلغ بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تا کہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کر سکیں۔ آپ کو ان غلط افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم کرنے ہیں جنہوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تا کہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جاسکے...... آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچنا ہے اور اس کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی قوت فہم کے مطابق اسے بات سمجھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بننا ہے تا کہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو، غرض فرائض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا اثاثہ مانگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اوڑھنے کے بعد کسی

دوسری چیز میں دلچسپی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے۔ یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑ دینا۔ جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پوراوقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو، جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی، اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں روک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ مومن، مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ کے بلند درجات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم واخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال ن اقترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومساکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره و الله لایهدی القوم الفاسقین (سورہ توبہ ۲۴)

یعنی اے نبی کہہ دو، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑنے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے۔ اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شیفتگی ہے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب اصلاً جائز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہٖ حرام نہیں ہے۔ مگر مومنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ فاسق (یعنی عہد شکن) قرار دیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنھوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے عہد کیا تھا کہ وہ دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں اپنی ساری قوت لگا دیں گے۔ جب صحابۂ کرام کے اس عہد پر بیس سال کی مدت گزر گئی اور انھوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ

دین کو قائم کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا:

ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون وعداً علیہ حقاً فی التوراۃ والانجیل والقرآن و من اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ و ذلک ھو الفوز العظیم (توبہ ۱۱۱)	اللہ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ہیں پھر مارتے رہے ہیں اور مارے جاتے رہے ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ ہجرت یا دوسرے لفظوں میں جائز مفادات کی قربانی انسان کی خدا پرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اقامتِ دین کی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے ہوں، جو اپنے معیارِ زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں، جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں، جو دنیوی زندگی میں اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کمی کر کے دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہئے بلکہ اس کے برعکس جو ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اپنے بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ نہ ہو کہ وہ آج کے فائدے پر کل کے فائدے کو ترجیح دے سکیں ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو قائم نہیں کیا ہے۔ اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہوسکتا۔

جہاد

اب جہاد[1] کو لیجئے، جہاد کے معنیٰ ہیں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کسی وقتی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی مارکس کے جدلیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر اس کے عدو کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام اداروں سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ صاحبِ ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف ایک اور ہی طرزِ زندگی کو اپنے گردوپیش کی دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک ایسی تیز گیس کی مانند بنا دیتا ہے جو کسی محدود خول کے اندر بند ہو اور ہر آن اس سے نکلنے کے لئے بے قرار ہو۔ یہ کش مکش اور جدوجہد کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلتا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بدن تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب یہ کش مکش اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ ماحول کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور جاہلی نظام شکست کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے

---

[1] امام راغب اصفہانی اپنی کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' میں اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جَہد اور جُہد کے معنی طاقت اور مشقت کے ہیں...... جهدت رايى ـــــ یعنی میں نے انتہائی غور وفکر کیا جو میرے بس میں تھا۔ اور جہاد اور مجاہدہ (جو اسی سے نکلے ہیں) کے معنیٰ ہیں دشمن کے مقابلے میں اپنی پوری قوت خرچ کرنا۔ اور جہاد کی تین قسمیں ہیں: دشمنِ ظاہر سے جہاد کرنا، شیطان سے جہاد کرنا اور نفس سے جہاد کرنا۔''

دین کو ''نجد'' کہا گیا ہے جس کے معنٰی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو اونچائی پر چڑھنے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ (بلد ۱۱۔۱۰) اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار۔ پہلی صورت میں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا ہوتا ہے۔ گاڑی کو کسی ڈھلوان راستہ پر چھوڑ دیجئے تو وہ خود لڑھکتی چلی جائے گی، اس کے لئے کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اسی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جا سکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لئے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا تو اس کو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست روک ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس، دوسرے طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذت اور آرام کو پسند کرتا ہے، اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے، وہ عزت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے بلکہ جدھر اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اکساتا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملتی ہو اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور عوام الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر دباؤ ڈالتا ہے اور جس کی انتہائی شکل وہ حکومتی تنظیم ہے جو غیر الٰہی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہو۔ یہ خارجی قوتیں براہِ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر عملاً قابض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انہی کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو مانے اور اپنے آپ کو ان سے ملوث کرے، اس کے بغیر وہ

زندہ نہیں رہ سکتا اور براہِ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حق پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے، وہ رائج الوقت نظام کے لئے موت کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کی تحریک لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو روکنے اور ان کو کچل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر باہر تک، خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک، قدم قدم پر بے شمار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف کو گوارا کرنا ہوتا ہے، کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش مکش کرنی ہوتی ہے، کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ڈھیر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے، کہیں عزت اور ناموری کے بجائے گم نامی اور ذلت پر قانع ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے، کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے دو مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں۔ اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہوئی نظر آتی ہے اور دوسری طرف جانے میں بظاہر کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جائے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاحمتوں کے باوجود آسان اور پرلطف راستہ کو چھوڑ دیتا ہے اور کھینچ کر اپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم سیاسی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش مکش کا ایک قدرتی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سیاسی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ تنقید نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق، جینے اور مرنے کا ارادہ جو ابتداءً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اسلامی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوعی درخت کی طرح اگایا نہیں جا سکتا اور نہ اس کو بوریوں میں

ابھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود اپنی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح انڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک روز اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ اس کے باہر آجائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں مخلص ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا سچا عزم رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو متزلزل کر رہا ہے، ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو توڑ دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں ٹھہر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش مکش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلہ میں پیش آئے اور چونکہ یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود اپنے نفس کے بالمقابل ہوتا ہے اور کبھی خارجی دنیا سے کش مکش کرتا ہے۔ اس کو کبھی خود اپنی خواہشوں سے لڑنا پڑتا ہے، کبھی زبان سے دوسروں کے طرز عمل پر گرفت کرنی ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ کی قوت سے راہِ حق کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جاھدوا اھواء کم کما تجاھدون اعدائکم[1] اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔

دوسری روایات میں آپؐ نے فرمایا:

المجاھدة تکون بالید و اللسان[2] مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں سے ہوتا ہے۔

مگر جہاد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے صرف کسی ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ اس مخصوص کیفیت کا نام ہے جو کسی عمل کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہری شکلیں اسی کیفیتِ جہاد کو پیدا کرنے کے لئے ہیں، نہ کہ خود ان ظاہری شکلوں کا نام جہاد ہے۔ ایک شخص رات دن کی کوشش سے اسلام پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھتا ہے۔ بظاہر یہ جہاد کی ایک شکل ہے لیکن اس کا مقصد اگر یہ ہے کہ اس کتاب سے اس کی شہرت ہوگی یا اس کو مالی فوائد حاصل ہوں گے تو اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں۔

[1]، [2] مفردات امام راغب، بیان— "جہد"۔

قرآن کی اصطلاح میں وہ جہاد کہے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کوئی نیک کام کرتے ہوئے جب اس کے دل میں ایک غلط خیال گزرتا ہے اور اس تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس طرح اس کا سارا کیا کرایا مٹّی ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور بے اختیار وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ـــ ''خدایا! مجھے شیطان کے حوالے نہ کرورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا'' تو یہ جہاد ہے۔

یہ بات صرف جہاد ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسری عبادت کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دین میں جو کام بھی کرنے کے لیے بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ جن اذکار اور دعاؤں کی فضیلت بیان کی گئی ہے، جن عبادات کے ادا کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، جن اخلاق و اعمال کو یہ اہمیت دی گئی ہے کہ ان کو اختیار کیے بغیر سرے سے دعویٰ ایمان ہی معتبر نہیں ہوتا۔ ان سب کا مطلب دراصل یہ بتانا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی کے مظاہر کیا ہوتے ہیں، نہ یہ کہ کن مظاہر کا نام خدا پرستی ہے۔ اصل میں خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ زبان سے اس کے لیے چند تعریفی کلمات کا وِرد کر لیا جائے، نماز روزہ اور حج کے نام پر کچھ مخصوص عبادتی افعال انجام دے دیئے جائیں۔ مال میں سے ایک مقررہ حصہ نکال کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یا زبان و قلم کے ذریعہ سے خدا کے دین کی تبلیغ کر دی جائے۔ بے شک یہی وہ اعمال ہیں جو خدا پرستانہ زندگی کے لیے لازمی پروگرام کی حیثیت رکھتے ہیں اور خدا پر ایمان جب بھی انسانی زندگی میں ظہور کرے گا وہ انھیں شکلوں میں ظہور کرے گا۔ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی اور قالب اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے۔ مگر ان خارجی شکلوں کے پیچھے وہ اصل چیز جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی موجودگی کسی آدمی کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اسے حاصل ہوں۔ وہ دراصل دل کی یہ اندرونی کیفیت ہے کہ آدمی کے جذبات و خیالات بالکل خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ اس کو وہی چیز پسند ہو جس کو خدا پسند کرتا ہے اور وہی چیز ناپسند ہو جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ جو چیز خدا کی مرضی کے خلاف ہو اس کا وہ دشمن بن جائے اور جو چیز خدا کو محبوب ہو اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا آخری سرمایہ تک قربان کر دے۔

یہ ہیں اسلام کے تقاضے جن کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص

جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے۔ جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں کھڑی کی جائے گی تو اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن، جب وہ مالکِ کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میرا وفادار رہا۔ مگر یہ کھلی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی شخص کو وفاداری کا سرٹیفکٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے، جو اپنی خدائی میں کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ کیا محض دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بناء پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک عظیم جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا استحقاق ثابت کر دے۔ شرک نہ دنیا کے معبودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر اس دن کا تصور کیجئے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز کیوں نہ ہو، جس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا

وزن کھو چکی ہوں گی، جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے اپنی ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کردی ہوتی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا، ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ وہ موت جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آئے گی۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروڑوں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جارہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جارہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب کردیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔ ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کروروں اور اربوں سال نہیں بلکہ ابد الایام...... تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کردیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دکان دار کی ہے جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جارہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا۔ اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آ کر ہم کو اس دنیا سے جدا کردے جہاں صِرف کرنا ہے اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صِرف پانا ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالکِ کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں گے کہ دنیا میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انہی پر نظر کرے گا۔

☆ ☆ ☆

اسلام ایک عظیم جدوجہد ہے۔ وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اُس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور ذاتی رجحانات کو خیر باد کہہ کر دینِ حق کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں فکری اور عملی جدوجہد کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ اپنی مقرر عمر پوری کر کے اپنے رب سے جا ملے۔

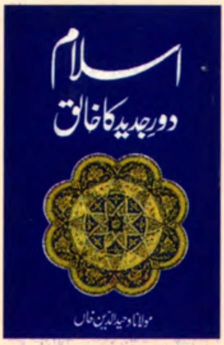

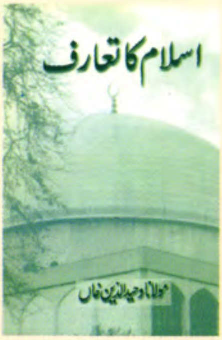

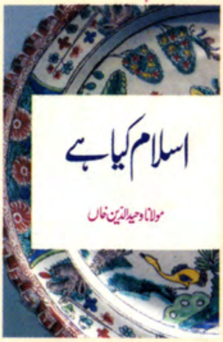

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-835-1
9 788178 988351
₹ 20